23

جماعت احمدیہ کا ہر فرد استقلال کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قربانی کرتا جائے

(فرمودہ 24 جولائی 1942ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

"یہ زمانہ جیسا کہ مَیں نے کئی دفعہ بیان کیا ہے اور بہت سے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں نہایت ہی ابتلاء اور ٹھوکر کا زمانہ ہے۔ لاکھوں آدمی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کروڑوں آدمی ہر روز مصائب اور مشکلات کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انسانی زندگی جتنی ارزاں ان ایام میں ہوئی ہے شاید کبھی بھی اتنی ارزاں نہیں ہوئی اور ابھی تک خونریزی کا جوش لوگوں کے دماغ سے نہیں اترا بلکہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ جہاں ہمیں ان باتوں کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی طرف رجوع اور دعا کی خواہش ہونی چاہئے وہاں اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ لڑائی ہمارے لئے ایک اَور رنگ میں بھی بہت بڑا سبق ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ ابتلاؤں اور لڑائیوں میں شہادت وغیرہ کی وجہ سے گھبرا جاتے ہیں اور کمزوری دکھانے لگتے ہیں مگر انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ جو مصائب اور مشکلات ان کو برداشت کرنے پڑتے ہیں ویسے ہی مصائب اور مشکلات کفار کو بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں اور جو قربانیاں ان کو دینی پڑتی ہیں ویسی قربانیاں کفار کو بھی دینی پڑتی ہیں۔ پھر فرمایا کہ ایک فرق ہے تم میں اور ان میں۔ اور وہ یہ کہ ان کی قربانیوں کے بدلہ میں کوئی ایسے انعام مقدر نہیں، موعود نہیں کہ جن کی خاطر ان کو قربانیاں کرنی پڑیں۔ لیکن تمہارے لئے تمہارے رب کی طرف

سے ایسے انعامات کا وعدہ ہے کہ جن کا اندازہ بھی عقل انسانی نہیں لگا سکتی اور جن کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ انسان ان کو جان ہی نہیں سکتا۔ فرمایا اگر کفّار بغیر کسی امید اور مقصد کے اور بغیر کسی انعام کے وعدہ کے یہ مصائب اور مشکلات برداشت کرتے اور قربانیاں کرتے ہیں تو تم کو جن کے ساتھ خدا تعالیٰ کے بڑے بڑے انعامات کے وعدے ہیں ان قربانیوں کے کرنے میں کیا ہچکچاہٹ ہو سکتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی جنگوں میں ایک طرف ابوجہل اپنے گھر سے نکلا اور یہ جانتے ہوئے نکلا کہ لڑائی میں انسان مارا بھی جاتا ہے، یہ جانتے ہوئے نکلا کہ لڑائی میں انسان ایسا زخمی بھی ہو سکتا ہے کہ ساری عمر اس کی چارپائی پر پڑے پڑے ہی کٹ جائے، یہ جانتے ہوئے نکلا کہ لڑائی میں انسان شدید زخمی ہو کر ناقابلِ برداشت درد میں مبتلا ہو سکتا ہے اور یہ جانتے ہوئے نکلا کہ لڑائی میں انسان قیدی بھی بن سکتا ہے اور باوجودیکہ وہ اپنی قوم کا سردار ہو اسے معمولی لوگوں کی غلامی بھی کرنی پڑتی ہے۔ پھر یہ جانتے ہوئے گھر سے نکلا کہ لڑائی میں انسان شکست بھی کھا جاتا ہے اور اسے اپنی قوم میں جو عزت اور سرداری حاصل ہے اسے کھو بیٹھتا ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے ابوجہل گھر سے لڑائی کے لئے نکلا۔ ان صورتوں کے ساتھ ایک فتح کی صورت میں اسے کیا امید ہو سکتی تھی؟ سوائے اس کے کہ سرداری ذرا اور پکی ہو جائے اور کچھ عرصہ کے لئے دل خوش ہو جائے کہ مَیں نے اپنے دشمنوں کو مار دیا یا ان کو شکست دے دی۔ مگر ان باقی صورتوں میں جو مَیں نے بیان کی ہیں اس کے لئے کیا امید ہو سکتی تھی۔ اگر وہ مر جاتا تو اسے کس بدلہ کی امید ہو سکتی تھی، ساری عمر کے لئے نکما ہو جانے کی صورت میں اسے کس انعام کی امید ہو سکتی تھی، غلام ہو جانے کی صورت میں اسے کس خوشی کی توقع ہو سکتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں حضرت ابوبکرؓ بھی مدینہ سے لڑائی کے لئے نکلے کہ انسان لڑائی میں مارا بھی جاتا ہے، یہ جانتے ہوئے نکلے کہ انسان لڑائی میں ایسا زخمی بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو جائے، یہ جانتے ہوئے نکلے کہ لڑائی میں انسان شدید زخمی بھی ہو سکتا ہے اور اس طرح مدتوں کے لئے وہ تکلیف کا شکار ہو سکتا ہے، یہ جانتے ہوئے نکلے کہ لڑائی میں انسان غلام بھی بن جاتا ہے اور اس طرح اسے دوسروں کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔

یہ جانتے ہوئے نکلے کہ لڑائی میں شکست بھی ہو سکتی ہے اور انسان اپنی قوم میں زیادہ عزت حاصل کرنے کی بجائے رسوا ہو جاتا ہے اور ذلیل ہو جاتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود ابوجہل اور حضرت ابو بکرؓ کے لڑائی میں جانے میں فرق تھا۔ جہاں ابوجہل یہ سمجھتا تھا کہ اگر مَیں لڑائی میں مارا گیا تو حیات کا خاتمہ ہو جائے گا اور میرے جسم کے ساتھ ہی میری روح بھی فنا ہو جائے گی۔ وہاں حضرت ابو بکرؓ جانتے تھے کہ اگر مَیں لڑائی میں مارا گیا تو خدا تعالیٰ کی رحمت فرشتوں کے ساتھ استقبال کے لئے آئے گی اور میری روح اس فانی جسم اور کمزور زندگی کو چھوڑ کر ایسی زندگی حاصل کرے گی جس کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہیں اور انعامات کی کوئی حدبندی نہیں۔ جہاں ابوجہل جانتا تھا کہ اگر لڑائی میں مارا گیا تو بیوی، بچوں، بہنوں، بھائیوں اور رشتہ داروں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں گا۔ وہاں حضرت ابو بکرؓ جانتے تھے کہ اگر مَیں مارا گیا تو اپنے باپ دادا حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کے پاس جاؤں گا۔ جہاں ابوجہل کو جدائی نظر آتی تھی وہاں حضرت ابو بکرؓ کو وصال سامنے دکھائی دیتا تھا۔ جہاں ابوجہل کے سامنے اگر یہ بات تھی کہ مَیں ایسا زخمی ہو سکتا ہوں کہ چارپائی پر ہی پڑے پڑے جان دینی پڑے، زندگی کا سکھ باقی نہ رہے اور ہمیشہ کے لئے بے کار ہو جاؤں۔ وہاں حضرت ابو بکرؓ بھی گو یہ سمجھتے تھے کہ ہو سکتا ہے لڑائی میں ایسا زخمی ہو جاؤں کہ چارپائی پر ہی پڑے پرے جان دینی پڑے مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مَیں جسم کے بیکار ہونے سے بے کار نہیں ہو سکتا بلکہ میرا ایسے خدا سے واسطہ ہے جس کا جسم کے اعمال سے تعلق نہیں بلکہ قلب سے ہے۔ اس خدا کے ساتھ جس کے حکم کے ماتحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگ کے موقع پر اپنے صحابہ سے فرمایا کہ اس جنگ میں جو تکالیف تمہیں اٹھانی پڑ رہی ہیں ان پر فخر نہ کرو اور یہ نہ سمجھو کہ تم نے کوئی بڑا کام کیا ہے۔ مدینہ میں بھی ایسے لوگ ہیں کہ جنہیں وہی ثواب پہنچتا ہے جو تمہیں پہنچتا ہے۔ تم تکلیف کی کوئی وادی ایسی نہیں گزرتے کہ جو ثواب تمہیں ملتا ہے انہیں نہ ملتا ہو اور کوئی مشکل ایسی نہیں کہ جس کا ثواب تمہیں پہنچتا ہو اور انہیں نہ پہنچتا ہو۔ صحابہ نے عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ! اس کا کیا مطلب ہے؟ تکالیف تو ہم اٹھاتے ہیں اور ثواب ان کو بھی مل جاتا ہے حالانکہ وہ گھروں میں بیٹھے ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو

ہر تکلیف دین کی راہ میں اٹھانے کی خواہش رکھتے ہیں مگر معذوری کی وجہ سے مجبور ہیں۔ ان کی بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتے ہوئے مر جانے کی خواہش ایسی ہی زبردست ہے جیسی تمہاری مگر وہ اندھے، لُولے یا لنگڑے ہیں اس وجہ سے جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے۔ وہ امنگ جو تمہارے دلوں میں پیدا ہوتی ہے ان کے دلوں میں بھی پیدا ہوتی ہے مگر وہ معذوری کی وجہ سے تمہارے ساتھ شامل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے جو ثواب تمہیں جسمانی تکالیف اٹھانے کی وجہ سے ملتا ہے وہ ان کو روحانی تکلیف کی وجہ سے مل جاتا ہے۔[1] مگر ابو جہل کو ناکارہ ہو جانے کی صورت میں ایسی کوئی امید کہاں ہو سکتی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ جانتے تھے کہ اگر لڑائی میں ایسے زخمی ہو گئے کہ تمام عمر چارپائی پر ہی پڑے رہیں تو بھی ان کے لئے روحانی اور قلبی کیفیات کا ذریعہ ایک ایسا ذریعہ ہے کہ جس سے وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ کارآمد اور مفید بنالیں گے۔ اگر ابو جہل یہ سمجھتا تھا کہ لڑائی میں شکست بھی ہو سکتی ہے تو ابو بکرؓ بھی یہ خیال کر سکتے تھے مگر فرق دونوں میں یہ ہے کہ ابو جہل سمجھتا تھا کہ مجھے بھی شکست ہو سکتی ہے لیکن ابو بکرؓ کامل مومن تھے اور اس لئے وہ کبھی یہ مان ہی نہ سکتے تھے کہ مجھے بھی شکست ہو سکتی ہے۔ مومن جانتا ہے کہ میرے لے دو ہی صورتیں ہیں یعنی یا یہ کہ مر کر خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کروں اور یا پھر فتح حاصل کروں۔ حضرت ابو بکرؓ لڑائی میں شکست کے تو قائل تھے مگر مومن کی شکست کے نہیں ہاں وہ مومن کی شہادت کے قائل تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مومن کبھی میدان سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ وہ یا تو فتح کے قائل تھے اور یا شہادت کے اور ایسے لوگ اگر مارے بھی جائیں تو جس طرح ان کی زندگیاں دوسرے لوگوں کے قلوب میں امنگوں کو تیز کرنے کا موجب ہوتی ہیں اور دوسروں کے لئے شمع راہ ہوتی ہیں اسی طرح وہ مر کر بھی انہی باتوں کا سامان کر دیتے ہیں۔ صحابہؓ کو اتفاقی حوادث کے سوا کبھی شکست نہیں ہوئی۔ بے شک احد میں انہیں پیچھے ہٹنا پڑا مگر شکست نہیں ہوئی بلکہ پیچھے ہٹ کر بھی وہ میدان جنگ کے ارد گرد ہی منڈلاتے رہے۔ دنیا میں ان کے سوا اَور کون سی قوم پیش کی جا سکتی ہے جسے بظاہر شکست ہو جائے اور پھر بھی وہ میدان سے نہ ہٹے۔ حنین میں بھی انہیں ایک اتفاقی حادثہ پیش آیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تقدیر کے طور پر کچھ عرصہ کے لئے ان کے قدم اکھڑ گئے مگر چند منٹ کے بعد ہی

وہ پھر سنبھل گئے اور واپس میدان میں آ پہنچے اس کے سوا کوئی اَور مثال نہیں کہ مسلمان میدان سے ہٹے ہوں۔ قرآن کریم میں ہے کہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں مومن وہی ہے جو میدانِ جنگ سے نہیں ہٹتا سوائے حملہ کرنے کی غرض سے یا بڑے لشکر سے ملنے کے لئے، شکست کھا کر وہ پیچھے نہیں ہٹتا۔[2] اور شکست کھانے والا مومن ہوتا ہی نہیں۔ حملہ کرنے کے لئے ہٹنا تو جنگ ہی کا حصہ ہے۔ ایک شخص دیکھتا ہے کہ اس جگہ کھڑے ہو کر میرا لڑنا اتنا مفید نہیں ہو سکتا جتنا فلاں جگہ پہنچ کر لڑنا مفید ہو سکتا ہے وہاں جا کر مَیں دشمن کو کمزور کر سکتا ہوں پس اس غرض سے وہ اگر پیچھے ہٹتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اسی طرح بڑے لشکر سے ملنے کے لئے ہٹنا بھی جائز ہے اور وہ اس طرح کہ اصل لشکر سے آگے ہراول دستے ہوتے ہیں پہلے زمانوں میں بھی ہوتے تھے اور آجکل بھی۔ ان کے لئے یہ حکم نہیں ہوتا کہ وہ دشمن سے لڑیں بلکہ ان کی ڈیوٹی صرف یہ ہوتی ہے کہ دشمن کی کمزوریاں معلوم کریں اور اصل فوج کو بتائیں وہ بیس تیس پچاس یا سَو دو سَو آدمی ہوتے ہیں جو اس بات کا اندازہ کرتے ہیں کہ کس جگہ سے دشمن پر حملہ کرنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ وہ یہ پتہ لے کر آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ فلاں جگہ دشمن کی پیدل فوج زیادہ ہے، فلاں جگہ سوار زیادہ ہیں، فلاں جگہ ٹینک اور فلاں جگہ توپیں زیادہ ہیں اور کمانڈر انچیف ان سب اطلاعات کو ملا کر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کیا وہاں حملہ کرنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے جہاں پیدل فوج زیادہ ہے یا وہاں مفید ہو سکتا ہے جہاں سوار ہیں۔ وہاں مفید ہو سکتا ہے جہاں توپیں ہیں یا وہاں مفید ہو سکتا ہے جہاں ٹینک ہیں۔ ہراول دستہ کی فراہم کردہ اطلاعات سے وہ پہلے ایک نقشۂ جنگ تیار کرے گا اور پھر اس کے ماتحت حملہ کرے گا اس لئے ہراول دستوں کا پیچھے ہٹنا شکست نہیں کہلا سکتا بلکہ ضروری ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سوائے ان دو صورتوں کے اور کوئی صورت مومن کے لئے میدان سے پیچھے ہٹنے کی نہیں اور جو ہٹتا ہے وہ مومن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نقشہ کھینچا ہے ہر زمانے کے کافروں اور مومنوں کے لئے۔ وہ مومنوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ جنگ میں کافر بھی مرتے ہیں اور تم بھی مرتے ہو، وہ بھی بھوکے رہتے ہیں اور تم بھی رہتے ہو، وہ بھی قیدی بنتے ہیں اور تم بھی ہو سکتے ہو، جو مصائب اور مشکلات تم اٹھاتے ہو وہی وہ بھی اٹھاتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں مگر

فرق ہے بھی اور وہ یہ کہ تمہارے لئے تمہارے خدا نے ایسے وعدے کر رکھے ہیں کہ جن کی موجودگی میں تم خدا تعالیٰ کے رستہ میں موت کو انعام سمجھتے ہو اور سزا یا تکلیف نہیں سمجھتے مگر کافروں کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا وعدہ نہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک صحابی لڑائی میں شہید ہو گئے۔ آپ نے ان کے لڑکے کو دیکھا کہ چہرہ پر غم کے آثار تھے۔ آپؐ نے ان کو بلایا اور فرمایا تمہیں اپنے باپ کی شہادت کا غم ہے۔ تم کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ شہادت کے بعد تمہارے باپ سے اللہ تعالیٰ نے کیا سلوک کیا تو یہ سب غم فوراً ہلکا ہو جائے۔ تمہارے باپ کی روح کو اللہ تعالیٰ نے سامنے بلایا اور فرمایا کہ مَیں تم سے اتنا خوش ہوں کہ تم مجھ سے جو کچھ مانگو مَیں دوں گا۔ تمہارے باپ نے اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ مَیں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تُو مجھے پھر زندہ کرے اور مَیں پھر اسلام کے لئے لڑ کر مارا جاؤں اور تُو پھر مجھے زندہ کرے اور مَیں پھر مارا جاؤں اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے تُو مجھے بار بار زندہ کرتا جائے اور مَیں ہر بار اسلام کے لئے لڑتا ہوا مارا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر مَیں اپنی جان کی قسم کھا کر یہ سنت نہ قائم کر چکا ہوتا کہ مُردوں کو اس دنیا میں واپس نہیں کروں گا تو مَیں تمہیں ضرور زندہ کر دیتا مگر میرا وعدہ ہے کہ مُردے اس دنیا میں واپس نہ جاسکیں گے۔[3] اس حدیث کو ہماری جماعت اس بات کی دلیل کے طور پر ہمیشہ استعمال کرتی ہے کہ حقیقی مُردے اس دنیا میں واپس نہیں آسکتے مگر اس سے ایک اَور سبق یہ ملتا ہے کہ مومن خدا تعالیٰ کے لئے جو تکالیف اٹھاتے ہیں وہ ان پر گراں نہیں گزرتیں بلکہ وہ ان کو بار بار اٹھانا چاہتے ہیں۔ پس ہمیں اس لڑائی سے یہ سبق بھی حاصل کرنا چاہئے کہ لڑنے والی قوموں کے افراد چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لئے یہ تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ ستمبر 1939ء کے شروع میں یہ لڑائی شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ستمبر 1940ء آیا۔ پھر ستمبر 1941ء اور اب ستمبر 1942ء سر پر کھڑا ہے۔ تین سال ہونے کو آئے ہیں اور جو لوگ اس میں حصہ لے رہے ہیں وہ متواتر تین سال سے دن رات تکالیف برداشت کر رہے ہیں۔ توپوں کے گولوں اور بموں سے ان کے کانوں کے پَردے پھٹ رہے ہوں گے، ان کو زمین پر سونا پڑتا ہے، بوجھ اٹھانے پڑتے ہیں، راتوں کو جاگنا پڑتا ہے، بھوکا رہنا

پڑتا ہے، اپنی جانوں کو ہر قسم کے خطرات میں ڈالنا پڑتا ہے مگر وہ برابر ان تکالیف میں چلے جاتے ہیں۔ اس سے ہمیں یہ سبق حاصل کرنا چاہئے کہ مومنوں کی قربانیاں ان لوگوں کے مقابل پر کتنی وسیع ہونی چاہئیں۔ اگر کافر دنیوی اغراض کے لئے چار پانچ یا سات سال تک مسلسل اپنے آپ کو خطرات میں ڈال سکتے ہیں تو مومن مسلسل ستّر سال تک بھی اپنے آپ کو خطرات میں ڈالتے جائیں تو کم ہے۔

ہماری جماعت کے لئے یہ سوال اَور بھی اہم ہے۔ ہندوستانی استقلال کے ساتھ مسلسل کام نہیں کر سکتے۔ بعض ڈاکٹر اسے ملیریا کا نتیجہ بتاتے ہیں کہ اس کے اثر کی وجہ سے انسان جلدی تھک جاتا ہے۔ یہاں ایک ہی میدانِ جنگ میں لڑائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مگر یورپ کی لڑائیاں کتنی لمبی چلتی جاتی ہیں۔ سالہا سال تک ایک لڑائی جاری رہتی ہے اور کسی کو یہ خیال تک نہیں آتا اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ اب چھ ماہ گزر گئے ہیں، اب سال گزر گیا ہے کہ ہمارے رشتہ دار میدان جنگ میں ہیں۔ وہاں کھانے کی تکلیف ان کو برداشت کرنی پڑ رہی ہے، کپڑے کافی نہیں مل سکتے، سفر میں متواتر رہنا پڑتا ہے اب لڑائی ختم ہونی چاہئے۔ مگر ہمارے ملک کا طریق یہ ہے کہ چھ ماہ یا سال کے بعد لوگ گھبرا کر سست ہو جاتے ہیں۔ مَیں نے خود اپنی جماعت میں دیکھا ہے۔ بڑی قربانی کرنے والی جماعت ہے مگر بہت کم عہدہ دار ہیں جو چھ سات یا آٹھ دس سال تک متواتر محنت سے کام کرتے چلے جائیں۔ ایک سیکرٹری بڑا اچھا کام کرتا ہے مگر چار پانچ سال کے بعد ہی وہ تھکا ہوا معلوم ہونے لگتا ہے یہی امارت اور صدارت کا حال ہے۔ ایک شخص امیر یا پریذیڈنٹ مقرر ہو کر بڑا اچھا کام کرتا ہے مگر 5، 7 سال کے بعد غفلت اور سُستی شروع ہو جاتی ہے۔ نہ معلوم یہ عادت کا نتیجہ ہے یا جیسا کہ بعض ڈاکٹروں کی رائے ہے ملیریا کا اثر ہے۔

بہر حال ہمارے ملک میں استقلال کے ساتھ لمبے عرصہ تک قربانی کی عادت نہیں مگر ہماری جماعت کو سوچنا چاہئے کہ جن قوموں سے اس کا مقابلہ ہے ان میں یہ خوبی موجود ہے اور جب تک ہماری جماعت اس کمزوری کو دور نہ کرے کسی صورت میں وہ فتح اور غلبہ حاصل نہیں کر سکتی۔ وہ دنیا پر کبھی غالب نہیں آ سکتی جب تک کہ اس عادت کو درست نہ کرے اور

جب تک ہر فرد ایسا نہ ہو کہ استقلال کے ساتھ قربانی کرتا چلا جائے اور ہر روز وہ پہلے روز سے زیادہ قربانی کے لئے اپنے آپ کو تیار پائے۔

خوب یاد رکھو کہ ہم نے ایسے دشمن کو زیر کرنا ہے جو استقلال کے ساتھ کام کرنے کا عادی ہے اور ہم اسے اسی صورت میں مغلوب کر سکتے ہیں کہ جب دلوں میں ایسا ایمان پیدا ہو جائے کہ یہ قربانیاں جو وہ کر رہا ہے ہمیں بہت ہی کم اور حقیر نظر آئیں۔ اگر ایک جرمن کو موت ایک پر کے برابر ہلکی نظر آتی ہو تو ہمیں اس پر کے ریشہ سے بھی ہلکی نظر آئے۔ اگر یہ تکالیف ایک جرمن کو ایک پر کے برابر ہلکی نظر آ رہی ہوں تو ہمارے دل کا احساس ان کو پر کے ریشہ سے بھی ہلکا بتا رہا ہو۔ یہ ضروری چیزیں ہیں۔ جب تک یہ ہم میں پیدا نہ ہوں ہم دنیا پر غالب نہیں آ سکتے۔ کچھ روز کام کر کے تھکان محسوس کرنے کے معنے یہ ہیں کہ کچھ عرصہ شیطان کا مقابلہ کر کے اس کے لئے دروازے کھول دیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا پچھلا کِیا کرایا بھی رائیگاں چلا جائے۔ اس کی مثال تو ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص دو گھنٹہ تک تو چوروں کا مقابلہ کرے مگر پھر مکان کا دروازہ کھول دے۔ اس کے لئے تو یہی بہتر تھا کہ پہلے ہی کھول دیتا تا خواہ مخواہ مار نہ کھاتا اور زخمی نہ ہوتا۔ جو قوم کچھ عرصہ کے بعد تھک کر ہتھیار ڈال دیتی ہے وہ بے وقوف ہے۔ اس کے لئے تو پہلے ہی مرحلہ پر ہتھیار ڈال دینا مناسب تھا۔ ہتھیار اٹھانے کا حق اسے ہی ہے جو آخر دم تک مقابلہ کرے اور ان کے لئے تیار ہو۔

مسلمانوں میں آج تک جتنی بھی تحریکات شروع ہوئیں وہ اسی طرح ختم ہو گئیں۔ جب خلافت کی تحریک شروع ہوئی تو اتنا جوش تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا سارا ہندوستان ملک سے باہر چلا جائے گا اور اس میں شبہ نہیں کہ بعض لوگوں نے بڑی بڑی قربانیاں بھی کیں۔ اچھے اچھے عہدوں والوں نے نوکریاں چھوڑ دیں اور ہجرت کر کے چلے گئے۔ انہوں نے اپنی بڑی بڑی قیمتی جائدادیں اونے پونے کر کے بیچ ڈالیں اور یہاں سے چلے گئے مگر پانچ چھ ماہ کے بعد ہی یہ سارا جوش مٹ گیا اور آج ان مہاجرین کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ جو لوگ باہر گئے ان میں سے کچھ تو دھکّے کھا کر واپس آ گئے، کچھ مر گئے اور کچھ ایسے ہیں جو ابھی تک ارد گرد کے ملکوں میں پھر رہے ہیں اور اب کہیں بھی وہ جوشِ ہجرت نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد حال میں مسجد شہید گنج کی

تحریک شروع ہوئی اور مسلمانوں میں ایسا جوش تھا کہ معلوم ہوتا تھا مسلمان پنجاب کے چپہ چپہ پر شہید گنج بنا دیں گے اور یہ نظر آتا تھا کہ پہلے تو شہید گنج نام اس وجہ سے تھا کہ بقول سکھوں کے یہاں بعض سکھوں نے جانیں دے دی تھیں مگر اب مسلمان اسے شہید گنج بنائیں گے اور لاکھوں مسلمانوں کا خون اس کی دیواروں پر چھینٹے دے گا مگر آج دیکھ لو نہ وہ تحریک ہے اور نہ کسی کو وہ یاد ہے۔ سکھ آج بھی اسی طرح اس پر قابض ہیں اور وہ لوگ جو سارے پنجاب میں شور مچا رہے تھے ان کا نام و نشان بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر مسلمان کسی ایک تحریک کے متعلق بھی استقلال سے کام لیتے تو آج ہندوستان میں ان کی حالت بہت بہتر ہوتی۔ اگر خلافت کی تحریک کچھ عرصہ کے بعد دب نہ جاتی مگر بڑھتی ہی چلی جاتی تو مسلمانوں کے حق میں نتیجہ مفید نکلتا اور جو لوگ باہر گئے تھے وہ واپس آکر یہاں عزت کی زندگی بسر کرتے۔ اسی طرح شہید گنج کی تحریک خواہ غلط تھی یا ٹھیک۔ اگر مسلمان قربانیاں کرتے جاتے تو آج کسی کو ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔

یاد رکھو کہ قربانی دل دہلا دینے والا شور نہیں بلکہ استقلال کے ساتھ قربانیاں پیش کرتے جانا اصل چیز ہے۔ یورپ کے لوگ اس بات کو جانتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں اس لئے انہیں عزت اور عروج حاصل ہے۔ صدیاں گزر جاتی ہیں مگر ان کے استقلال میں فرق نہیں آتا۔ افراد کے ساتھ ان کے مقاصد کا تعلق نہیں بلکہ قوم کے ساتھ مقاصد کا تعلق ہوتا ہے۔ صلیبی جنگوں کو دیکھو یورپ کی قومیں پاگلوں کی طرح شام پر حملے کرتی رہیں اور ستّر سال تک لڑتی رہیں مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کے بعد مسلمانوں نے تو یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے دشمن کو شکست دے دی اور گھروں میں غافل ہو کر سو گئے لیکن اہل یورپ کے دلوں میں سات سَو سال تک بھی وہ چنگاری سلگتی رہی اور آخر اس صدی میں انگریزوں نے وہاں قبضہ کر ہی لیا۔ وہی میدان جس میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے فرانس کے بادشاہ فلپ اور انگلستان کے بادشاہ رچرڈ کو شکستیں دی تھیں اس پر آج ان کا قبضہ ہے بلکہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر پر بھی انہی لوگوں کا قبضہ ہے۔ اگر وہی چنگاری مسلمانوں کے دل میں بھی سلگتی رہتی اور وہ ہمیشہ اس بات کو مد نظر رکھتے کہ ان کے ملک پر قبضہ کرنا اہل یورپ کا منشاء ہے اور ہر مسلمان کے

دل میں یہ عزم ہوتا کہ یہ قبضہ نہیں ہونے دینا تو یہ کبھی نہ ہو سکتا اور مسلمانوں کو یہ ذلت پر ذلت نہ اٹھانی پڑتی۔ مگر افسوس کہ مسلمان ایک لڑائی کے بعد غافل ہو گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے حالانکہ دشمن نے دوسرے طریق پر حملہ شروع کر دیا تھا۔ دشمن نے سوچا کہ مسلمان کیوں فتح پاتے ہیں اور ہمیں کیوں شکست پر شکست ہوتی ہے؟ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے پاس تجارت ہے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم بھی تجارت کی طرف متوجہ ہوں گے۔ انہوں نے سوچا کہ مسلمانوں کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں یونیورسٹیاں ہیں اور وہ علم پڑھتے ہیں چنانچہ انہوں نے خود بھی یونیورسٹیاں قائم کیں اور نئی نئی ایجادوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ مسلمان اس واسطے ہم پر غالب آجاتے ہیں کہ ان کے پاس سمندری بیڑا ہے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم بھی اب اپنا بیڑا بنائیں گے نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے بیڑے چھوٹے ہوتے گئے اور ان کے بڑھتے گئے۔ مسلمانوں کی تجارت گرتی گئی اور ان کی بڑھتی گئی۔ مسلمانوں کی یونیورسٹیاں بند ہوتی گئیں اور ان کی ترقی کرتی گئیں۔ وہ لوگ مسلمانوں کے ملک میں آئے اور جس طرح مَیں نے بتایا ہے کہ ہراول دستے دشمن کی فوج کی کمزوریوں سے اپنی فوج کو اطلاع دیتے ہیں۔ یہی کام انہوں نے کیا، یہاں سے وہ خبریں لے کر جاتے اور اپنے لوگوں کو مسلمانوں کی طاقت کے مرکزوں سے آگاہ کرتے۔ اس طرح انہوں نے اپنے لئے طاقت کے سامان پیدا کر لئے اور مسلمانوں نے وہ سامان کھو دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان غلام ہو گئے اور وہ غلام قومیں بادشاہ بن گئیں۔ اگر مسلمان بھی سات سَو سال تک جنگ کو جاری رکھ سکتے تو آج دشمن شام پر قابض نہ ہوتا بلکہ آج فرانس اور جرمنی میں بھی اسلامی پرچم لہرا رہے ہوتے۔ اس وقت مسلمانوں کے پاس طاقت اور قوت تھی اور اگر وہ دھاوا بولتے تو بآسانی ان ملکوں کو فتح کر سکتے تھے مگر افسوس کہ مسلمانوں ں نے ایک ہی لڑائی پر جنگ کا خاتمہ سمجھ لیا۔

یورپ کی لڑائیاں جو بہت چھوٹے چھوٹے اصولوں کے لئے ہوتی ہیں، لمبے عرصہ تک چلی جاتی ہیں۔ انگلینڈ اور جرمنی کی لڑائی چھوٹے چھوٹے اصولوں کے لئے ہی ہے۔ مگر ایک کے بعد دوسری جنگ اب ہو رہی ہے۔ آج انگلستان کے لوگ گالیاں دیتے ہیں ان لوگوں کو

جنہوں نے پہلی جنگ کو آخری سمجھ لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ آج ہمیں جس قدر مشکلات پیش آ رہی ہیں وہ سب انہی ناواقف اور جاہل لوگوں کی وجہ سے ہیں جنہوں نے پہلی جنگ کو ہی آخری سمجھ لیا۔ یہی حال مسلمانوں کا تھا۔ انہوں نے بھی پہلی لڑائی کو آخری سمجھ لیا اور اس بات پر فخر کرنے لگے کہ ہم نے ستّر سال تک دشمن کا مقابلہ کیا ہے حالانکہ وہ ستّر سال تو ابتدا تھی اور اس سات سَو سال کی جنگ کا دسواں حصہ تھا۔

پس مَیں جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس جنگ سے سبق حاصل کرے اور فائدہ اٹھائے۔ اس کا ہر پہلو بُرا ہے مگر بُرا بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ پہلی لڑائی کے 25 سال بعد ہی جرمنی نے پھر لڑائی شروع کر دی اور یہ بہت بری بات ہے مگر اس سے ہمیں یہ سبق حاصل ہو سکتا ہے کہ دشمن کی شکست پر تسلی نہیں پانی چاہئے کیونکہ کچھ عرصہ کے بعد وہ پھر بھی سر اٹھا سکتا ہے۔ پھر لڑنے والی قوموں کے افراد قربانیاں کر رہے اور تکالیف اٹھا رہے ہیں۔ ہمیں بھی اس سے یہ سبق حاصل کرنا چاہئے کہ ہم بھی دین کے لئے قربانیاں کریں جرمن مائیں اپنے بچوں کو قربان کر رہی ہیں، جرمن تاجر اپنی تجارتوں کو تباہ کر رہے ہیں اور عوام طرح طرح کی تکالیف اٹھا رہے ہیں اور ہم اگر ان سے زیادہ قربانیاں کریں تبھی خدا تعالیٰ کی فوج میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اگر ان کے برابر ہی کریں تو ہم میں اور ان میں کیا فرق ہوا؟ اور اگر ان سے کم کریں تو نہایت ہی شرمناک بات ہو گی۔ پس ہمیں ان سے بہت زیادہ قربانیوں کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہئے۔

مَیں نے دیکھا ہے کہ کئی لوگ جماعت میں ایسے ہیں جو کسی تحریک پر کہہ دیتے ہیں کہ ہمیشہ چندے ہی مانگے جاتے ہیں۔ کیا ان کا مطلب یہ ہے کہ دس یا پندرہ سال تک چندہ دینے کے بعد پھر ان سے نہ مانگا جائے؟ وہ اس کو بڑی قربانی سمجھتے ہیں کہ چند سال تک چندہ دے دیا مگر ہم کہتے ہیں کہ دس یا پندرہ سال تو کیا اگر تم اس اصول پر قائم رہو تو پندرہ سَو سال تک بھی چندے دینے پڑیں گے۔ پندرہ سال کے بعد چندوں کا سلسلہ ختم سمجھنے کے یہ معنے ہیں کہ ایسا شخص زندگی کے پندرہ سال ہی سمجھتا ہے حالانکہ اگر احمدیت دس ہزار سال تک رہنی ہے تو ہر ایک دن قربانی کا مطالبہ ہوتا رہے گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی صوفی کا یہ

مقولہ سنایا کرتے تھے کہ جو دم غافل سو دم کافر۔ غفلت تو انسان کو کفر کے گڑھے میں گرا دیتی ہے۔ پس یہ خیال کرنا کہ فلاں قربانی کے بعد اَور قربانی نہ کرنی پڑے گی بالکل غلط ہے۔ کیا معلوم کہ اگلا مطالبہ اس سے بھی سخت ہو۔ اگر آج روپیہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو کل ممکن ہے جائداد کا کرنا پڑے اور پرسوں ممکن ہے اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان کی قربانی دینی پڑے۔ جو شخص مومن کہلاتا ہے وہ یہ خیال بھی کیسے کر سکتا ہے کہ کوئی دن ایسا آئے گا کہ قربانی کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ جو شخص ایسا خیال کرتا ہے وہ احمق ہے۔ کیا نماز، زکوٰۃ، صدقہ اور دوسرے احکام کا دروازہ کبھی بند ہوتا ہے جو قربانی کا بند ہو جائے۔ خدا تعالیٰ کے احکام میں سے کسی حکم کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ کیا کبھی اللہ تعالیٰ نے کسی کو حکم دیا ہے کہ تم نے دس سال تک سچ بولا، اب دو چار سال جھوٹ بول سکتے ہو؟ پندرہ سال تک تم نے لوگوں کے اموال کی حفاظت کی اب تمہیں اجازت ہے کہ کچھ عرصہ ڈاکے مار لو اور لوگوں کے اموال لوٹ لو؟ پس کوئی شخص یہ خیال بھی کیسے کر سکتا ہے کہ قربانیاں دس پندرہ سال تک ہیں اس کے بعد یہ بند ہو جائیں گی۔ یاد رکھو کہ قربانیاں ہمیشہ رہیں گی۔ ہاں ان کی شکلیں بدلتی رہیں گی۔ جس دن قوم کے افراد کی کثرت قربانی کی روح سے محروم ہو جائے گی وہ دن اس قوم کی موت کا دن ہو گا۔ اور جو شخص اس دن کا منتظر ہے جس دن قربانیوں کا سلسلہ بند ہو جائے وہ گویا اس دن کا منتظر ہے جس دن احمدیت مر جائے۔ پہلی قومیں اسی طرح مری ہیں اور ہماری موت بھی اگر ہوئی تو اسی وجہ سے ہو گی۔ قربانیاں قوموں کا سانس ہوتی ہیں جس طرح سانس جب تک چلتا ہے تب تک انسان زندہ رہتا ہے اسی طرح جب تک کسی قوم میں قربانیوں کی روح زندہ رہتی ہے تب تک وہ قوم بھی زندہ رہتی ہے۔

پس لڑائی سے سبق حاصل کرو اور ایسے خیالات کو ہرگز پاس نہ آنے دو کہ کسی وقت قربانیوں کا مطالبہ ختم ہو جائے گا بلکہ ہمیشہ یہ خیال رکھو کہ کل آج سے زیادہ قربانی کرنی پڑے گی۔ اسی لئے مَیں نے تحریک جدید میں یہ بات رکھی تھی کہ چاہے کوئی شخص ایک پیسہ ہی بڑھائے گزشتہ سال سے زیادہ ضرور دے تا اس کے ہر سال کی قربانی گزشتہ سال کی نسبت زیادہ ہو۔ پس یہ کبھی خیال نہ کرو کہ یہ قربانیاں بوجھ ہیں جو تم کو کچل دیں گی بلکہ یاد رکھو کہ یہ

قوم کی زندگی کا سانس ہیں اس لئے ان کو جاری رہنے دو تا قوم کی زندگی باقی رہے۔ جو شخص قربانیوں کا سلسلہ بند کرنا چاہتا ہے وہ گویا احمدیت کا گلا گھونٹنا چاہتا ہے۔ جس دن قربانیوں کا سلسلہ بند ہوا اُسی دن احمدیت کا خاتمہ سمجھو۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور ہماری نسلوں کو اس دن سے بچائے۔" (الفضل 31 جولائی 1942ء)

1: ابن ماجہ کتاب الجِہاد باب مَنْ حَبَسَہُ الْعُذْرُ مِنَ الْجِہَادِ

2: وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ (الانفال:17)

3: اسد الغابۃ جلد 3 صفحہ 233 مطبوعہ ریاض 1286ھ